© rasailojaraid.com

اسلامی دستور کی تدوین

(۲)

حکومت کی تشکیل کیسے ہو؟ ان بنیادی امور کی توضیح کے بعد ہمارے سامنے پانچواں سوال آتا ہے۔ یہ کہ جو ریاست ان بنیادوں پر تعمیر ہو اس کا نظام چلانے کے لیے حکومت کی تشکیل کیسے کی جائے؟ اس معاملے میں سب سے اہم مسئلہ رئیسِ مملکت (Head of the State) کے تقرر کا ہے جس کو اسلام میں امام، امیر اور خلیفہ کی مختلف اصطلاحوں سے یاد کیا جاتا ہے، اور اس باب میں اسلام کے مسلک کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسلام کی ابتدائی تاریخ کی طرف رجوع کریں۔

صدرِ ریاست کا انتخاب جیسا کہ آپ سب حضرات جانتے ہیں، ہمارے موجودہ اسلامی معاشرے کا آغاز مکے میں کفر کے ماحول میں ہوا تھا اور اس ماحول سے لڑ کر اسلامی معاشرے کی ابتدا کرنے والے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ یہ اسلامی معاشرہ جب اپنے نظم اور سیاسی خود مختاری میں ترقی کر کے ایک اسٹیٹ بننے کی منزل پر پہنچا تو اس کے اولین رئیس بھی آنحضورؐ ہی تھے، اور آپ کسی کے منتخب کردہ نہ تھے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیے ہوئے تھے۔

دس سال تک آپؐ اس ریاست کی امارت کا فریضہ انجام دینے کے بعد رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے بغیر اس کے کہ اپنی جانشینی کے متعلق کوئی صریح اور قطعی ہدایت دے کر تشریف لے جاتے۔ آپ کے اس سکوت سے، اور قرآن مجید کے اس ارشاد سے کہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (مسلمانوں کے معاملات آپس کے مشورے سے انجام پاتے ہیں)، صحابۂ کرام نے یہ سمجھا کہ نبی کے بعد رئیسِ مملکت کا تقرر مسلمانوں کے اپنے انتخاب پر چھوڑا گیا ہے، اور یہ انتخاب مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے[1]۔ چنانچہ خلیفۂ اول

---

[1] اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں سے حضرات شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کی طرح امامت کا دباقی صفحہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب مجمع عام میں ہوا۔

پھر جب ان کا آخری وقت آیا تو اگرچہ ان کی رائے میں خلافت کے لیے موزوں ترین شخص حضرت عمرؓ تھے، لیکن انہوں نے اپنے جانشین کو نامزد نہیں کیا بلکہ اکابر صحابہ کو الگ الگ بلا کر ان کی رائے معلوم کی، پھر حضرت عمرؓ کے حق میں اپنی وصیت املا کرائی، پھر حالتِ مرض ہی میں اپنے حجرے کے دروازے سے مسلمانوں کے مجمع عام کو خطاب کر کے فرمایا:

اترضون بمن استخلف علیکم؟ فانی واللہ ما الوت من جھد الرأی ولا ولیت ذا قرابۃ۔ وانی استخلفت عمر بن الخطاب فاسمعوا لہ واطیعوا۔	کیا تم راضی ہو اس شخص سے جس کو میں تم پر اپنا جانشین بناؤں؟ خدا کی قسم میں نے غور و فکر کر کے رائے قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، اور اپنے کسی رشتہ دار کو مقرر نہیں کیا ہے۔ میں نے عمر بن الخطاب کو جانشین بنایا ہے۔ پس تم ان کی سنو اور اطاعت کرو۔

مجمع سے آوازیں آئیں:-

سمعنا و اطعنا	ہم نے سنا اور مانا

اس طرح مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ کا تقرر بھی نامزدگی سے نہیں ہوا بلکہ خلیفۂ وقت نے مشورے سے ایک شخص کو تجویز کیا اور پھر مجمع عام میں اس کو پیش کر کے منظور کرا دیا۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ کے دنیا سے رخصت ہونے کی باری آئی۔ اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد ترین رفیقوں میں سے چھ اصحاب ایسے موجود تھے جن پر خلافت کے لیے مسلمانوں کی نگاہ پڑ سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے انہی چھ اصحاب کی ایک مجلس شوریٰ بنا دی اور ان کے سپرد یہ کام کیا کہ باہمی مشورے سے ایک شخص کو خلیفہ تجویز کریں، اور اعلان کر دیا کہ

(بقیہ حاشیہ صــــ) منصب بھی توقیفی ہے، یعنی امام بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مامور ہوتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف اب عملاً ختم ہو گیا ہے کہ شیعہ حضرات کے نزدیک بھی بارھویں امام کی غیبت کے بعد چونکہ منصب امامت ان کے ظہور ثانی تک موقوف ہے، اس لیے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کی سربراہ کاری اب بہرحال کسی غیر مامور من اللہ ہی کے سپرد ہونی چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

من امّر منکم علی غیر مشورۃ من المسلمین فاضربوا عنقہ
تم میں سے جو کوئی مسلمانوں کے مشورے کے بغیر زبردستی امیر بنے اس کی گردن ماردو

اس مجلس نے بالآخر انتخاب کا کام حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے سپرد کیا اور انہوں نے مدینے میں چل پھر کر عام لوگوں کی رائے معلوم کی۔ گھر گھر جا کر عورتوں تک سے پوچھا۔ مدرسوں میں جا کر طلبہ تک سے دریافت کیا۔ مملکت کے مختلف حصوں کے جو لوگ حج سے اپنے اپنے علاقوں کی طرف واپس جاتے ہوئے مدینے ٹھیرے تھے اُن سے استصواب کیا۔ اور اس تحقیقات سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ امت میں سب سے زیادہ معتمد علیہ دو شخص ہیں، عثمانؓ اور علیؓ۔ اور ان دونوں میں سے عثمانؓ کی طرف زیادہ لوگوں کا میلان ہے۔ اسی رائے پر آخر کار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ ہوا اور مجمع عام میں ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔

پھر حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور امت میں سخت افراتفری برپا ہو گئی۔ اس موقع پر چند صحابہ حضرت علیؓ کے مکان پر جمع ہوئے اور ان سے عرض کیا کہ آج آپ سے زیادہ امارت کا حق دار کوئی نہیں ہے، آپ اس بار کو سنبھالیں۔ حضرت علیؓ نے انکار کیا، مگر وہ اصرار کرتے رہے آخر کار حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اگر آپ لوگ یہی چاہتے ہیں تو مسجد میں چلیے۔

فان بیعتی لاتکون خفیا ولا تکون الا عن رضا من المسلمین
کیونکہ میری بیعت خفیہ طور پر نہیں ہو سکتی، اور مسلمانوں کی عام رضامندی کے بغیر اس کا انعقاد ممکن نہیں ہے

چنانچہ آپ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے اور مہاجرین و انصار جمع ہوئے اور سب کی نہیں تو کم از کم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت کی مرضی سے آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔

پھر جب حضرت علیؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد کیا ہم آپ کے صاحبزادے حضرت حسن سے بیعت کریں؟ اس پر انہوں نے جواب دیا وہ یہ تھا کہ

ما آمرکم ولا انھاکم، انتم ابصر
میں نہ تم کو اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تم لوگ خود اچھی طرح دیکھ سکتے ہو۔

یہ ہے رئیسِ مملکت کے تقرر کے معاملے میں خلافتِ راشدہ کا تعامل اور صحابۂ کرام کا اجماعی طرزِ عمل جس کی بنیاد خلافت کے باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سکوت اور تمام اجتماعی معاملات کے باب میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ پر رکھی گئی تھی۔ اس مستند دستوری رواج سے جو بات قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں صدر کا انتخاب عام لوگوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔ کوئی شخص خود زبردستی امیر بن جانے کا حق نہیں رکھتا[1]۔ کسی خاندان یا طبقے کا اس منصب پر اجارہ نہیں ہے[2]۔ اور انتخاب کسی جبر کے بغیر مسلمانوں کی آزادانہ رضامندی سے ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی پسند کیسے معلوم کی جائے، تو اس کے لیے اسلام میں کوئی خاص

[1] بعض لوگ یہاں یہ شبہ پیدا کرتے ہیں کہ اگر اسلام کا اصول یہی ہے تو پھر دورِ بادشاہی کے نامور علماء نے زبردستی مسلط ہو جانے والے لوگوں کی خلافت و امارت کیسے تسلیم کر لی؟ لیکن یہ شبہ دراصل دو مختلف مسائل کو خلط ملط کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ اسلام میں خلیفہ یا امیر کے تقرر کا صحیح و معتبر طریقہ کیا ہے۔ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کبھی کسی وجہ سے غلط طریقے پر کوئی شخص مسلط ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے۔ پہلے مسئلے کا جواب تمام علماء امت نے بالاتفاق یہی دیا ہے کہ صحیح طریق کار انتخاب ہے جو مسلمانوں کی رضامندی سے ہو۔ رہا دوسرا مسئلہ تو اس میں زیادہ سے زیادہ نرم رویہ جن بزرگوں نے اختیار کیا ہے وہ بھی اس سے آگے نہیں جاتے کہ ایسی امارت صرف نظم اور اجتماعِ کلمۂ مسلمین کی خاطر برداشت کر لینی چاہیے بشرطیکہ اس طرح جبراً مسلط ہونے والا امیر نظامِ دین کو خراب نہ کرے۔ بالفاظ دیگر یہ لوگ اس شرط کے متحقق ہونے کی صورت میں جابرانہ امارت کے خلاف بغاوت کرنا درست سمجھتے ہیں تاکہ کہیں نظم کی جگہ بدنظمی نہ لے لے۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں ان کے نزدیک جبری تسلط انعقادِ خلافت کی کوئی صحیح صورت ہے۔

[2] اس معاملے میں بھی بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ پھر ان احادیث کی کیا توجیہ ہے جن میں خلافت کے لیے قبیلۂ قریش کو احق ٹھیرایا گیا ہے۔ مگر اس کا جواب ہم اپنی کتاب "رسائل و مسائل" میں دے چکے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طریق کار مقرر نہیں کر دیا گیا ہے۔ حالات اور ضروریات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ ان سے معقول طور پر یہ معلوم کیا جا سکتا ہو کہ جمہور قوم کا اعتماد کس شخص کو حاصل ہے۔

مجلسِ شوریٰ کی تشکیل انتخابِ امیر کے بعد دوسرا اہم مسئلہ اہل الحل والعقد (یعنی مجلسِ شوریٰ کے ارکان) کا ہے کہ وہ کیسے چنے جائیں گے اور کون ان کو چنے گا۔ سرسری مطالعے کی بنا پر لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ خلافتِ راشدہ میں چونکہ عام انتخابات (General Elections) کے ذریعہ سے ارکانِ شوریٰ منتخب نہیں ہوتے تھے اس لیے اسلام میں سرے سے مشورے کا کوئی قاعدہ ہی نہیں ہے، بلکہ یہ بات بالکل خلیفۂ وقت کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ جس سے چاہے مشورہ لے۔ لیکن یہ گمان دراصل اس زمانے کی باتوں کو اِس زمانے کے ماحول میں رکھ کر دیکھنے سے پیدا ہوا ہے۔ حالانکہ اُن کو اُسی وقت کے ماحول میں رکھ کر دیکھنا چاہیے اور عملی تفصیلات کے اندر وہ اصول سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جو ان میں ملحوظ رکھے گئے تھے۔

اسلام مکۂ معظمہ میں ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھا تھا۔ تحریکوں کے مزاج کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ جو لوگ سب سے پہلے آگے بڑھ کر ان کو لبیک کہتے ہیں وہی لیڈر کے رفیق، دست و بازو اور مشیر ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلام میں بھی جو سابقین اولین تھے وہ بالکل ایک فطری طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق اور مشیر قرار پائے جن سے آپ ہر ایسے معاملے میں مشورہ کرتے تھے جس میں خدا کی طرف سے کوئی صریح حکم آیا ہوا نہ ہوتا تھا۔ پھر جب اس تحریک میں نئے نئے آدمیوں کا اضافہ ہونے لگا اور مخالف طاقتوں سے اس کی کشمکش بڑھتی گئی تو ایسے لوگ خود بخود نمایاں ہوتے چلے گئے جو اپنی خدمات، قربانیوں، اور بصیرت و فراست کی بنا پر جماعت میں ممتاز تھے۔ ان کا انتخاب ووٹوں سے نہیں بلکہ تجربات اور آزمائشوں سے ہوا تھا جو الکشن کی بہ نسبت زیادہ صحیح اور فطری طریق انتخاب ہے۔ اس طرح مکہ چھوڑنے سے پہلے ہی دو قسم کے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن بن چکے تھے۔ ایک سابقین اولین۔ دوسرے وہ آزمودہ کار اصحاب جو بعد میں جماعت کے اندر نمایاں ہوئے۔ یہ دونوں گروہ ایسے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح تمام مسلمانوں کا اعتماد حاصل تھا۔

اس کے بعد ہجرت کا اہم واقعہ پیش آیا، اور اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ڈیڑھ دو سال پہلے مدینے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چند با اثر لوگ اسلام قبول کر چکے تھے اور ان کے اثر سے اوس اور خزرج کے قبیلوں میں گھر گھر اسلام پہنچ گیا تھا۔ انہی لوگوں کی دعوت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مہاجرین اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینے منتقل ہوئے اور وہاں اسلام کی اس تحریک نے ایک سیاسی نظام اور ایک ریاست کی شکل اختیار کی۔ اب یہ بالکل ایک قدرتی بات تھی کہ مدینے میں جن لوگوں کے اثر سے اسلام پھیلا اور پھیلتا گیا وہی اس جدید معاشرے اور سیاسی نظام میں مقامی لیڈروں کی پوزیشن پر فائز ہوئے، اور انہی کا یہ مرتبہ و مقام تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس شوریٰ میں سابقین اولین، اور آزمودہ کار مہاجرین کے ساتھ ایک تیسرے عنصر (انصار) کی حیثیت سے شامل ہوں۔ یہ لوگ بھی فطری طریق انتخاب سے منتخب ہوئے تھے اور مسلمان قبیلوں کے ایسے معتمد علیہ تھے کہ اگر موجودہ زمانے کے طریقے پر انتخابات منعقد ہوتے تب بھی یہی لوگ منتخب ہو کر آتے۔

پھر مدنی معاشرے میں دو قسم کے لوگ اور ابھرنے شروع ہوئے۔ ایک وہ جنہوں نے آٹھ دس برس کی سیاسی، فوجی اور تبلیغی مہمات میں کارہائے نمایاں انجام دیے حتیٰ کہ ہر اہم معاملے میں انہی کی طرف لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ دوسرے وہ لوگ جنہوں نے قرآن کے علم و فہم اور دین میں تفاہت کے اعتبار سے ناموری حاصل کی حتیٰ کہ عوام الناس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علمِ دین میں انہی کو سب سے زیادہ معتبر سمجھنے لگے اور خود آنحضورؐ نے بھی یہ فرما کر ان کو سندِ اعتبار عطا کی کہ قرآن فلاں شخص سے سیکھو، اور فلاں نوعیت کے مسائل میں فلاں شخص کی طرف رجوع کرو۔ یہ دونوں عناصر بھی مجلس شوریٰ میں بالکل ایک فطری انتخاب سے شامل ہوتے چلے گئے اور ان میں بھی کسی کے لیے ووٹ لینے کی حاجت پیش نہ آئی۔ ووٹ اگر لیے بھی جاتے تو اس معاشرے میں ان کے سوا کوئی ایسا نہ تھا جس پر مسلمانوں کی نگاہِ انتخاب پڑتی۔

اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانے میں وہ مجلس شوریٰ بن چکی تھی جو بعد کو خلفائے راشدین کی شوریٰ قرار پائی، اور وہ دستوری روایات بھی مستحکم ہو چکی تھیں جن کے مطابق آگے چل کر ایسے نئے لوگ اس مجلس میں شامل ہوتے گئے جنہوں نے اپنی خدمات اور اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتوں کے ذریعہ سے قبولِ عام حاصل کر کے اس مجلس میں اپنی جگہ پیدا کی۔ یہی وہ لوگ تھے جن کو اہل الحل والعقد مانا جاتا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ٹھونکنے والے، کہا جاتا تھا اور جن کے مشورے کے بغیر خلفائے راشدین کسی اہم معاملے کا فیصلہ نہ کرتے تھے۔ ان کی آئینی حیثیت کا صحیح اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد چند اصحاب نے حضرت علیؓ کے پاس حاضر ہو کر خلافت قبول کرنے کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا:

لیس ذالک الیکم، انما ھو لاھل الشوریٰ واھل بدر فمن رضی بہ اھل الشوریٰ واھل بدر فھو الخلیفۃ فنجتمع وننظر فی ھذا الامر

یہ معاملہ تمہارے فیصلہ کرنے کا نہیں ہے۔ یہ تو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر کا کام ہے جس کو اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر پسند کریں گے وہی خلیفہ ہوگا۔ پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملے پر غور کریں گے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہل الحل والعقد اُس وقت کچھ متعین لوگ تھے جو پہلے سے اس پوزیشن پر فائز چلے آ رہے تھے اور وہی ملت کے اہم معاملات کا فیصلہ کرنے کے مجاز تھے۔ لہٰذا یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ خلیفۂ وقت من مانے طریقے پر جس وقت جس کو چاہتا تھا مشورے کے لیے بلا لیتا تھا اور کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ مستقل اہلِ شوریٰ یا اہلِ حل و عقد کون ہیں جو قوم کے مسائل مہمہ کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔[1]

[1] یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ اہلِ حل و عقد صرف مدینے ہی کے لوگ کیوں ہوتے تھے؟ ملک کے دوسرے حصوں سے معتمد علیہ نمائندے کیوں نہیں بلائے جاتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ اس کے دو نہایت معقول وجوہ تھے اول یہ کہ اسلامی ریاست ایک قومی ریاست نہ تھی بلکہ اس طرح وجود میں آئی تھی کہ پہلے ایک نظریے کی تبلیغ نے لوگوں میں ذہنی و اخلاقی انقلاب برپا کیا، پھر اس انقلاب کے نتیجے میں ایک اصولی معاشرہ پیدا ہوا اور پھر اس معاشرے نے ایک اصولی ریاست کی شکل اختیار کی۔ اس قسم کی ریاست میں فطرۃً مرکزِ اعتماد وہ شخص واحد تھا جس نے اس انقلاب کی بنا ڈالی، اور اس کے بعد وہ لوگ اس پوری انقلابی سوسائٹی کے اندر مرکزِ اعتماد بنے جو بانیٔ انقلاب کے دستِ راست تھے۔ ان کی لیڈرشپ ایک فطری لیڈرشپ تھی اور ان کے سوا کوئی بھی اس سوسائٹی میں لوگوں کا معتمد علیہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تنقید کی مکمل آزادی کے باوجود اُس دور میں کبھی عرب کے کسی گوشے سے یہ آواز نہ اٹھی کہ صرف مدینے ہی کے لوگ آخر "باندھنے اور ٹھونکنے" کے اجارہ دار کیوں بن بیٹھے ہیں۔ ؎

؎ دوم یہ کہ اس زمانے کے تمدنی حالات میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ افغانستان سے لے کر شمالی افریقہ تک پھیلی ہوئی مملکت میں عام انتخابات منعقد ہوا کرتے اور پھر مجلس شوریٰ کے معمولی اور غیر معمولی اجلاسوں میں مملکت کے ہر حصے سے ارکانِ مجلس آ آ کر شریک ہوا کرتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلافتِ راشدہ کے اس تعامل، بلکہ خود اسوۂ نبوی سے جو قاعدۂ کلیہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امیر کو مشورہ ہر کس وناکس سے، یا اپنی مرضی کے چنے ہوئے لوگوں سے نہیں بلکہ اُن لوگوں سے کرنا چاہیے جو عامۂ مسلمین کے معتمد ہوں، جن کے اخلاص وخیر خواہی اور اہلیت پر لوگ مطمئن ہوں، اور حکومت کے فیصلوں میں جن کی شرکت اس امر کی ضامن ہو کہ ان فیصلوں کے نفاذ میں جمہور قوم کا دلی تعاون شریک ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ عوام کے معتمد لوگ کیسے معلوم کیے جائیں، تو ظاہر ہے کہ اس چیز کے معلوم ہونے کی جو صورت آغازِ اسلام کے مخصوص حالات میں تھی آج وہ صورت نہیں ہے، اور اس زمانے کے تمدنی حالات میں جو موانع موجود تھے وہ بھی آج موجود نہیں ہیں۔ اس لیے ہم آج کے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے وہ تمام ممکن اور مباح طریقے اختیار کر سکتے ہیں جن سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ جمہور قوم کا اعتماد کن لوگوں کو حاصل ہے۔ آج کل کے انتخابات بھی اس کے جائز طریقوں میں سے ایک ہیں، بشرطیکہ اُن میں وہ ذلیل ہتھکنڈے استعمال نہ ہوں جنہوں نے جمہوریت کو ایک مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔

حکومت کی شکل اور نوعیت | اس کے بعد تیسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت کی شکل اور نوعیت کیا ہے۔ اس باب میں جب ہم خلافتِ راشدہ کے دَور پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں امیر المومنین اصل وہ شخص تھا جس سے سمع وطاعت کی بیعت کی جاتی تھی اور جسے بھروسے کا آدمی سمجھ کر لوگ اپنی اجتماعی زندگی کے اہم ترین معاملے یعنی حکومت کی باگ ڈور سپرد کرتے تھے۔ اس کی حیثیت انگلستان کے بادشاہ، فرانس کے صدر، برطانیہ کے وزیر اعظم، امریکہ کے صدر، اور روس کے اسٹالن، سب سے مختلف تھی۔ وہ محض صدرِ ریاست ہی نہ تھا بلکہ اپنا رئیس الوزراء بھی آپ ہی تھا۔ وہ پارلیمنٹ میں براہِ راست خود شریک ہوتا تھا اور آپ ہی پارلیمنٹ کی صدارت بھی کرتا تھا۔ پھر وہ مباحثوں میں بھی پورا حصہ لیتا تھا اور اپنی حکومت کے سارے کاموں کی جواب دہی کرتا اور اپنا حساب آپ دیتا تھا۔ اس کی پارلیمنٹ میں نہ کوئی گورنمنٹ پارٹی تھی نہ اپوزیشن پارٹی۔ ساری پارلیمنٹ اس کی پارٹی تھی اگر وہ حق کے مطابق چلے، اور ساری پارلیمنٹ اپوزیشن تھی اگر وہ باطل کی طرف جاتا نظر آئے۔ ہر ممبر آزاد تھا کہ جس معاملے میں اس سے اتفاق رکھتا ہو اتفاق کرے اور جس میں اس سے اختلاف رکھتا ہو اختلاف کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلیفہ کے اپنے وزراء تک پارلیمنٹ میں اس کے خلاف اظہار رائے کر جاتے تھے، اور پھر بھی وزارت اور صدارت میں خوب نبھتی تھی۔ کسی کے مستعفی ہونے کا سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔ خلیفہ صرف پارلیمنٹ ہی کے سامنے جواب دہ نہ تھا بلکہ پوری قوم کے سامنے اپنے ہر کام، حتیٰ کہ اپنی شخصی زندگی کے معاملات تک میں جوابدہ تھا۔ وہ پانچوں وقت مسجد میں پبلک کا سامنا کرتا، ہر جمعے کو پبلک سے خطاب کرتا، اور پبلک اپنے شہر کے گلی کوچوں میں ہر روز چلتے پھرتے اس کو پا سکتی تھی اور ٹوک سکتی تھی۔ ہر شخص ہر وقت اس کا دامن پکڑ کر اپنا حق مانگ سکتا تھا، اور ہر شخص مجمع عام میں اس سے بازپرس بھی کر سکتا تھا۔ اس کے ہاں یہ قاعدہ نہ تھا کہ حکومت سے کوئی سوال کرنا ہو تو پارلیمنٹ کا کوئی ممبر ہی نوٹس دے کر لگے بندھے قواعد کے مطابق پوچھ سکتا ہے۔ اس کا اعلان عام تھا کہ

إن أحسنت فأعينوني وإن أسأت فقوموني ... أطيعوني ما أطعت الله ورسوله فإن عصيت الله ورسوله فلا طاعة لي عليكم۔

اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کرو، اور اگر برا رویہ اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو ... جب تک میں اللہ اور رسول کا مطیع رہوں میری اطاعت کرو، اور اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تمہارے ذمے نہیں ہے۔

یہ طرز حکومت، جس پر موجودہ زمانے کی اصطلاحوں میں سے کسی اصطلاح کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا، اسلام کے مزاج سے پوری مناسبت رکھتا ہے اور ہمارا آئیڈیل یہی ہے۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں نبھ سکتا ہے جبکہ سوسائٹی اسلام کے انقلابی نظریات کے مطابق پوری طرح تیار ہو چکی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی سوسائٹی میں انحطاط رونما ہوا، اس کا نبھنا مشکل ہو گیا۔ اب اگر ہم اس آئیڈیل کی طرف پھر پلٹنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ابتدائے کار کے لیے اس سے چار بنیادی اصول لے لیں اور پھر انہیں اپنے حالات و ضروریات کے مطابق عملی جامہ پہنائیں:۔

ایک یہ کہ حکومت کی اصل ذمہ داری جس کے بھی سپرد کی جائے وہ نہ صرف پبلک کے نمائندوں کا بلکہ خود پبلک کا بھی سامنا کرے اور اپنا کام نہ صرف مشورے سے انجام دے بلکہ اپنے اعمال کے لیے جواب دہ بھی ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے یہ کہ پارٹی سسٹم سے نجات حاصل کی جائے جو نظام حکومت کو بے جا عصبیتوں سے آلودہ کرتا ہے اور جس میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک جاہ پسند ٹولا برسرِ اقتدار آ کر پبلک کے خرچ پر اپنے مستقل حمایتی پیدا کرے اور پھر لوگ خواہ کتنا ہی شور مچائیں وہ ان حمایتیوں کے بل پر اپنی من مانی کرتا رہے۔

تیسرے یہ کہ نظام حکومت ایسے پیچدار ضابطوں پر قائم نہ کیا جائے جس سے کام کرنے والے کے لیے کام کرنا اور حساب لینے والوں کے لیے حساب لینا اور خرابی کے اصل ذمہ دار کو مشخص کرنا مشکل ہو جائے۔

اور سب سے آخری مگر سب سے اہم اصول یہ ہے کہ صاحب امر اور اہلِ شوریٰ ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن کے اندر اسلام کی بتائی ہوئی صفات زیادہ سے زیادہ پائی جاتی ہوں۔

اولی الامر کے اوصاف | یہ اوصاف (Qualifications) کا سوال اسلامی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، حتیٰ کہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی دستور کے چلنے یا نہ چلنے کا سارا انحصار ہی اس پر ہے۔

امارت اور مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لیے ایک اہلیت تو قانونی نوعیت کی ہوتی ہے جس پر ایک ناظم انتخاب اور ایک جج جانچ اور پرکھ کر انتخاب کے لیے ایک شخص کے اہل (Eligible) ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور دوسری ایک اور قسم کی اہلیت بھی ہوتی ہے جس کا لحاظ کر کے اشخاص کو چھانٹنے اور تجویز کرنے اور ووٹ دینے والے اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی اہلیت ایک ملک کے کروڑوں باشندوں میں سے ہر ایک میں ہوتی ہے، مگر یہ دوسری قسم کی اہلیت ہی ہے جو عملاً ان میں سے چند ہی آدمیوں کو ابھار کر اوپر لاتی ہے۔ پہلی قسم کی اہلیت کے معیارات صرف دستور کی چند عملی دفعات (Operative Clauses) میں درج کرنے کے لیے ہوتے ہیں، لیکن یہ دوسری قسم کی اہلیت وہ ہے جس کے معیارات پورے دستور کی روح میں موجود ہونے چاہئیں اور ایک دستور کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ جمہور کے ذہن کو تربیت دے کر صحیح انتخاب کے لیے تیار کیا جائے تاکہ وہ ایسے ہی لوگوں کو منتخب کریں جو دستور کی روح کے مطابق اہلیت رکھتے ہوں۔

قرآن اور حدیث ان دونوں قسم کی اہلیتوں سے بحث کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی اہلیت کے لیے انہوں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چار معیار بتائے ہیں:۔

(۱) مسلم ہونا، چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ — اے ایمان لانے والو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔

(۲) مرد ہونا، چنانچہ قرآن کہتا ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ — مرد عورتوں پر قوام ہیں

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لن يُفلح قوم ولّوا امرهم امرأة — وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جس نے اپنی زمام کار ایک عورت کے سپرد کی۔

(۳) عاقل و بالغ ہونا، چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا — اور اپنے مال جنہیں اللہ نے تمہارے لیے ہستی کا سہارا بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔

(۴) دارالاسلام کا باشندہ ہونا، چنانچہ قرآن تصریح کرتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا — اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کرکے دارالاسلام میں نہ آگئے تمہارا اُن کی ولایت میں کوئی حصہ نہیں جب تک کہ ہجرت نہ کریں۔

یہ ہیں وہ چار قانونی صفات جن کے لحاظ سے ہر شخص امارت اور رکنیت شوریٰ کا اہل ہو سکتا ہے۔ مگر اس طرح کے بے شمار قانونی اہل اشخاص میں سے کن لوگوں کو ہمیں ان مناصب کے لیے چننا چاہیے اور کن کو نہ چننا چاہیے، اس سوال کا واضح جواب ہمیں قرآن اور حدیث میں یہ ملتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا — اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں (یعنی ذمہ داری کے مناصب) اہل امانت (یعنی امین لوگوں) کے سپرد کرو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ

تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے

قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

نبی نے کہا کہ اللہ نے حکمرانی کے لیے اس کو (یعنی طالوت کو) تم پر ترجیح دی ہے اور اس کو علم اور جسم میں فراوانی عطا کی ہے

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا۔

کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس کا کام حدود آشنا نہیں ہے۔

من وقر صاحب بدعۃٍ فقد اعان علیٰ ہدم الاسلام

جس نے کسی صاحب بدعت کی توقیر کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

انّا واللہ لا نولّی علیٰ عملنا ہٰذا احداً سألہ او حرص علیہ

بخدا، ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی منصب پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو۔

ان اخونکم عندنا من طلبہ

ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود اس کا طالب ہو

ان اوصاف میں سے بعض کو تو ہم بآسانی اپنے دستور کی عملی دفعات میں رکھ سکتے ہیں، مثلاً یہ کہ طالب منصب کو انتخاب کے لیے نااہل قرار دیا جائے۔ رہے دوسرے اوصاف جن کے لیے کوئی قانونی حد تعین نہیں کی جا سکتی، تو ان کو ہمارے دستور کی اصولی ہدایات میں شامل ہونا چاہیے، اور ناظم انتخابات کے فرائض میں یہ بات داخل ہونی چاہیے کہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر عوام کو ان صفات سے باخبر کرنے کی کوشش کرے جو اسلام میں اولی الامر کے لیے مطلوب ہیں۔

شہریت اور اس کی بنیادیں | اب شہریت کے مسئلے کو لیجیے۔ اسلام چونکہ ایک نظامِ فکر و عمل ہے اور اسی نظام کی بنیاد پر وہ ایک ریاست قائم کرتا ہے، اس لیے وہ اپنی ریاست میں شہریت کی دو قسمیں قرار دیتا ہے۔ پھر چونکہ راستبازی و حق گوئی اسلام کی اصل روح ہے، اس لیے وہ بغیر کسی مکر و فریب کے صاف صاف شہریت کی اس تقسیم کو بیان بھی کر دیتا ہے، دنیا کو دھوکا دینے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا کہ زبان سے اپنے سب شہریوں کو یکساں قرار دے اور عمل میں ان کے درمیان نہ صرف تمیز کرے بلکہ ان کے ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عنصر کو انسانی حقوق تک دینے میں بے انصافی سے کام لے، جیسا کہ امریکہ میں حبشیوں کا اور روس میں غیر اشتراکیوں کا اور تمام دنیا کی لادینی جمہوریتوں میں قومی اقلیتوں کا حال ہے۔

شہریت کی دو قسمیں جو اسلام نے کی ہیں، یہ ہیں:-

ایک، مسلم۔

دوسرے، ذمی۔

(۱) مسلم شہریوں کے باب میں قرآن کہتا ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنی جان و مال سے راہ خدا میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہ ایک دوسرے کے ولی ہیں، اور جو لوگ ایمان لائے مگر ہجرت کر کے (دار الاسلام) میں نہ آئے، تمہارے لیے ان کی ولایت میں سے کچھ نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔

اس آیت میں شہریت کی دو بنیادیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک ایمان۔ دوسرے دار الاسلام کی رعایا ہونا یا بن جانا۔ اگر کوئی شخص ایمان رکھتا ہو، مگر دار الکفر کی تابعیت ترک کر کے (جسے لفظ ہجرت سے تعبیر کیا گیا ہے) دار الاسلام میں نہ آبسے، تو وہ دار الاسلام کا شہری نہیں ہے۔ اس کے برعکس تمام ایسے اہلِ ایمان جو دار الاسلام کے باشندے ہوں، قطع نظر اس سے کہ وہ دار الاسلام ہی میں پیدا ہوئے ہوں یا کسی دار الکفر سے ہجرت کر کے آئے ہوں[1]، دار الاسلام کے یکساں شہری اور ایک دوسرے کے

[1] ہجرت کر کے آنے والوں کے معاملے میں ایک احتیاطی تدبیر قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ ان کو "امتحان" (Examine) کر کے لیا جائے (ملاحظہ ہو سورۂ ممتحنہ رکوع ۲)۔ یہ تدبیر اگرچہ مہاجر عورتوں کے معاملے میں بیان کی گئی ہے، لیکن اس سے ایک عام اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے ایک مدعی ہجرت کو دار الاسلام میں قبول کرنے سے پہلے اس کے واقعی مسلم اور مہاجر ہونے کا اطمینان کر لیا جائے تاکہ ہجرت کے (باقی ص ۲۴۶ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(ولی، حامی و مددگار) ہیں۔

ان مسلم شہریوں پر اسلام نے اپنے پورے نظام کے اٹھانے کی ذمہ داری ڈالی ہے، کیونکہ وہی اصولاً اس نظام کو حق مانتے ہیں۔ اُن پر وہ اپنا پورا قانون نافذ کرتا ہے۔ ان کو اپنے تمام مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور سیاسی احکام کا پابند کرتا ہے۔ ان کے ذمے اپنے سارے واجبات و فرائض عائد کرتا ہے۔ ان سے اپنی ریاست کی مدافعت کے لیے ہر قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور پھر انہی کو یہ حق بھی دیتا ہے کہ اس ریاست کے اولی الامر کا انتخاب کریں، اس کو چلانے والی پارلیمنٹ (مجلس شوریٰ) میں شریک ہوں اور اُس کے کلیدی مناصب پر مقرر کیے جائیں تاکہ اس اصولی ریاست کی پالیسی ٹھیک اس کے بنیادی اصولوں کے مطابق چل سکے۔ اس قاعدے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عہدِ نبوی اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں ایک مثال بھی اس امر کی نہیں مل سکتی کہ کسی ذمی کو مجلس شوریٰ کا رکن، یا کسی علاقے کا گورنر، یا کہیں کا قاضی، یا کسی شعبۂ حکومت کا وزیر یا ناظم، یا فوج کا کمانڈر بنایا گیا ہو، یا خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لینے کا موقع دیا گیا ہو حالانکہ ذمی خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے اور خلافتِ راشدہ کے دور میں تو ان کی آبادی کروڑوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ اگر فی الواقع ان امور میں حصہ لینا ان کا حق ہوتا تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اللہ کا نبی ان کی حق تلفی کیسے کر سکتا تھا اور نبی کے براہِ راست تربیت یافتہ لوگ مسلسل ۳۰ برس اس حق کو ادا کرنے سے کس طرح باز رہ سکتے تھے۔

(۲) ذمی شہریوں سے مراد وہ تمام غیر مسلم ہیں جو اسلامی ریاست کے حدود میں رہ کر اس کی اطاعت و وفاداری کا اقرار کریں، قطع نظر اس سے کہ وہ دارالاسلام میں پیدا ہوئے ہوں یا باہر سے آکر ذمی بننے کی درخواست کریں۔ اس طرح کے شہریوں کو اسلام اُن کے مذہب اور کلچر کے تحفظ اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، ان پر صرف اپنے ملکی قوانین نافذ کرتا ہے، ان کو ملکی قوانین میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کے حقوق دیتا ہے، ان کے لیے کلیدی مناصب کے سوا ہر قسم کی ملازمتوں کے دروازے کھلے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۵) بہانے کچھ دوسری نیت رکھنے والے لوگ نہ گھس آئیں۔ اگرچہ کسی شخص کے حقیقی ایمان کا حال سوائے خدا کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا لیکن ظاہری تحقیقات سے جہاں تک جانچ پڑتال کی جا سکتی ہو کر لینی چاہیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رکھتا ہے، ان کو شہری آزادیوں میں مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک کرتا ہے۔ ان کے ساتھ معاشی معاملات میں مسلمانوں سے الگ کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھتا، اور مملکت کے دفاع کی ذمہ داری سے انہیں مستثنیٰ کر کے اس کا پورا بار صرف مسلمانوں پر ڈالتا ہے۔

ان دو قسم کی شہریتوں پر اور ان کی الگ الگ حیثیتوں پر اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ پہلے اُس سلوک پر ایک نگاہ ڈال لے جو دنیا کی دوسری اصولی ریاستیں اپنے اصول کے نہ ماننے والوں سے، اور قومی ریاستیں اپنے حدود میں رہنے والی قومی اقلیتوں سے کر رہی ہیں۔ درحقیقت یہ بات پورے چیلنج کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک ریاست کے اندر اُس کی بنیادوں سے مختلف بنیاد وجود رکھنے والوں کی موجودگی جو پیچیدگی پیدا کرتی ہے اس کو اسلام سے زیادہ انصاف، رواداری اور فیاضی کے ساتھ کسی دوسرے نظام نے حل نہیں کیا ہے۔ دوسروں نے اس پیچیدگی کو زیادہ تر دو ہی طریقوں سے حل کیا ہے۔ یا تو انہیں مٹا دینے کی کوشش کی ہے یا شودر بنا کر رکھا ہے۔ اسلام اسکے بجائے یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ انصاف کے ساتھ اپنے اصول کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان ایک حد قائم کر دیتا ہے۔ جو ماننے والے ہیں ان کو پوری طرح اپنے اصولوں کا پابند کرتا ہے اور ان اصولوں کے مطابق ریاست کا نظام چلانے کی ذمہ داری ان پر ڈال دیتا ہے اور جو اُن اصولوں کو قبول نہیں کرتے ان کو صرف اُسی حد تک پابند کرتا ہے جو ملک کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے اور انہیں ریاست کا نظام چلانے کی ذمہ داری سے سبکدوش کرنے کے بعد ان کے تمام تمدنی اور انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔

حقوقِ شہریت اس کے بعد مجھے یہ بتانا ہے کہ اسلام میں شہریوں کے بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کیا قرار دیئے گئے ہیں۔

شہریوں کا اولین حق اسلام میں یہ ہے کہ ان کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے اور جائز قانونی وجوہ کے سوا اور کسی وجہ سے ان پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔ اس چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے اپنا وہ مشہور خطبہ دیا تھا جس میں اسلامی نظامِ زندگی کے قواعد بیان فرمائے تھے۔ اُس میں آپؐ نے فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِنَّ دماءکم و اموالکم و اعراضکم حرام کحرمۃ یومکم ھٰذا۔ تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسی حج کے اس دن کی حرمت ہے۔

اس حرمت میں استثناء صرف ایک ہے اور اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک اور حدیث میں اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ کے الفاظ سے ادا فرماتے ہیں یعنی اسلام کے قانون کی رو سے اگر کسی شخص پر جان یا مال یا آبرو کا کوئی حق واجب ہوتا ہو تو وہ اس سے قانون کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق وصول کیا جائے گا۔

دوسرا اہم حق شخصی آزادی کی حفاظت ہے۔ اسلام میں کسی شخص کی آزادی معروف قانونی طریقے پر اُس کا جرم ثابت کیے بغیر اور اُسے صفائی کا موقع دیے بغیر سلب نہیں کی جاسکتی۔ ابوداؤد میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ مدینے میں کچھ لوگ شبہ کی بنا پر گرفتار کیے گئے تھے۔ ایک صحابی نے عین خطبۂ جمعہ کے دوران میں اُٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ میرے ہمسایوں کو کس قصور میں پکڑا گیا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ اُن کے اِس سوال کو سُن کر سکوت اختیار فرمایا "تاکہ کوتوال شہر اگر گرفتاری کے لیے کوئی معقول وجہ رکھتا ہے تو اُٹھ کر بیان کرے" لیکن جب تیسری مرتبہ اُن صحابی نے اپنے سوال کا اعادہ کیا اور کوتوال نے کوئی وجہ بیان نہ کی تو آپ نے حکم صادر فرمایا کہ خَلُّوا لَہٗ جِیْرَانَہٗ (اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو)۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک کسی شخص پر ایک متعین الزام لگا کر اس کو ثابت نہ کر دیا جائے اُسے قید نہیں کیا جا سکتا۔ امام خطابی اپنی معالم السنن میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسلام میں حبس دو ہی قسم کا ہے۔ ایک حبس عقوبت، یعنی یہ کہ عدالت سے سزا پاکر کوئی شخص قید کیا جائے، دوسرے حبس استظہار، یعنی ملزم کو بغرض تفتیش روک رکھنا۔ اِس کے سوا حبس کی کوئی صورت اسلام میں نہیں ہے۔ یہی بات امام ابو یوسف نے بھی اپنی کتاب الخراج میں لکھی ہے کہ کسی شخص کو محض تہمت کی بنا پر قید نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو مجرد الزام پر قید نہیں کر دیا کرتے تھے، ضروری ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ عدالت میں حاضر ہوں۔ مدعی اپنا ثبوت پیش کرے اور اگر وہ اپنا الزام ثابت نہ کر سکے تو مدعا علیہ کو چھوڑ دیا جائے"۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ لَا یُوْسَرُ رجلٌ فی الاسلام بغیر العدل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیسرا اہم حق رائے اور مسلک کی آزادی کا ہے۔ اِس باب میں اسلامی قانون کی سب سے بہتر وضاحت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ ان کے زمانے میں خوارج کا گروہ پیدا ہوا تھا جو آج کل انارکسٹ اور نہلسٹ (Nihilist) گروہوں سے ملتا جلتا تھا۔ حضرت علیؓ کے زمانے میں وہ علانیہ اسٹیٹ کے وجود کی نفی کرتے تھے اور بزورِ شمشیر اسٹیٹ کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ حضرت علیؓ نے اُن کو پیغام بھیجا۔

کونوا حیث شئتم وبیننا وبینکم ان لا تسفکوا دمًا ولا تقطعوا سبیلا ولا تظلموا احدًا

تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خونریزی اور رہزنی نہ اختیار کرو اور ظلم سے باز رہو۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت علیؓ نے ان کو پیغام دیا کہ

لا نبدءُکم بقتال مالم تحدثوا فسادًا

جب تک تم فساد نہ کرو گے ہم تمہارے خلاف لڑائی کی ابتدا نہ کریں گے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی گروہ خیالات جو چاہے رکھے اور پُرامن طریقے سے جس طرح چاہے اپنے خیالات کا اظہار کرے، اسلامی مملکت اُس کو نہ روکے گی، البتہ اگر وہ اپنے خیالات زبردستی (By violent means) مسلّط کرنے اور نظامِ ملکی کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے تو اُس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

ایک اور حق جس پر اسلام میں بہت زور دیا گیا ہے یہ ہے کہ اسٹیٹ اپنے حدود میں کسی شہری کو زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہنے دے۔ اِسی غرض کے لیے اسلام میں زکوٰۃ فرض کی گئی ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

السلطانُ ولیّ من لّا ولیّ لہ

حکومت ہر اُس شخص کی ولی (دست گیر و مددگار) ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔

اور ایک دوسری حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ :-

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مَنْ ترک کلاً فالینا — جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے۔

اِس معاملے میں اسلام نے ذمی شہریوں اور مسلم شہریوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے وہ مسلمانوں کی طرح ذمیوں کو بھی اِس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ اسٹیٹ اُس کو بھوکا، ننگا اور بے ٹھکانا نہ رہنے دیگا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو آپ نے فوراً اس کا جزیہ معاف کرکے اس کا وظیفہ مقرر کیا اور اپنے افسر خزانہ کو لکھا۔

واللہ ما انصفناہ ان اکلنا شبیبتہ ثم نخذلہ عند الھرم — خدا کی قسم ہم نے اُس سے انصاف نہ کیا اگر جوانی میں اُس سے فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اُسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

حضرت خالد نے حیرہ کے غیر مسلموں کو جو وثیقہ لکھ کر دیا تھا اُس میں یہ صراحت تھی کہ جو شخص بوڑھا ہو جائیگا یا جو کسی آفت کا شکار ہو گا یا جو مفلس ہو جائیگا اُس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اُس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی۔

شہریوں پر حکومت کے حقوق ان حقوق کے مقابلے میں شہریوں پر ریاست کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں، اُن میں سے پہلا حق اطاعت کا ہے جس کے لیے اسلام میں سمع و طاعت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ (سننا اور ماننا پڑے گا، تنگی اور فراخی میں اور خوشگواری اور ناخوشگواری میں) یعنی خواہ کوئی حکم آدمی کو گوارا ہو یا ناگوار اور خواہ کوئی شخص اُس کو بآسانی بجا لا سکے یا دشواری سے، بہر حال اُسے اطاعت کرنی پڑے گی۔

اسلامی حکومت کا دوسرا اہم حق اس کے شہریوں پر یہ ہے کہ وہ اس کے وفادار اور خیر خواہ رہیں۔ قرآن اور حدیث میں اس کے لیے نُصح کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جس کا مفہوم عربی زبان میں (Allegiance) اور (Loyalty) سے زیادہ وسیع ہے۔ اُس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک آدمی سچے دل سے اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکومت کی بھلائی چاہے۔ اُس کو نقصان پہنچانے والی کسی چیز کو گوارا نہ کرے اور اُس کی فلاح وبہبود سے قلبی وابستگی رکھے۔

یہی نہیں بلکہ اسلام میں شہریوں پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے ساتھ پورا تعاون کریں اور اُس کے لیے کسی جانی ومالی قربانی میں دریغ نہ کریں، حتیٰ کہ اگر دارالاسلام کو کوئی خطرہ پیش آجائے تو قرآن مجید صاف الفاظ میں اُس شخص کو منافق قرار دیتا ہے جو قدرت رکھنے کے باوجود دارالاسلام کی مدافعت میں جان ومال کی قربانی سے دریغ کرے۔

حضرات! یہ ہیں اُس حکومت کے خدوخال جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں۔ اس طرز کی حکومت کو آپ موجودہ زمانے کی اصطلاحوں میں سے جس نام سے چاہیں یاد کریں۔ آپ کا جی چاہے اسے سیکولر کہیے، ڈیموکریٹک کہیے یا تھیوکریٹک، ہمیں کسی اصطلاح پر اصرار نہیں ہے۔ ہمیں جس چیز پر اصرار ہے وہ صرف یہ ہے کہ جس اسلام کے ماننے کا ہم دعویٰ کرتے ہیں ہمارا نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت اُسی کے بتلائے ہوئے اور مقرر کیے ہوئے اصولوں پر قائم ہو۔

سوالات وجوابات

تقریر کے بعد حاضرین کی طرف سے جو سوالات کیے گئے اور اُن کے جو جوابات دیے گئے اُن میں سے خاص خاص سوالات وجوابات حسبِ ذیل ہیں:۔

سوال۔ خلافتِ راشدہ کے بعد مسلمانوں کی جو حکومتیں مختلف زمانوں میں قائم ہوئیں، وہ اسلامی حکومتیں تھیں یا غیر اسلامی؟

جواب:۔ درحقیقت نہ وہ پوری اسلامی تھیں نہ پوری غیر اسلامی۔ اُن میں اسلامی دستور کی دو اہم چیزوں کو بدل دیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ امارت انتخابی ہو، دوسرے یہ کہ حکومت کا نظام مشورے سے چلایا جائے۔ باقی ماندہ اسلامی دستور، چاہے اپنی صحیح اسپرٹ میں برقرار نہ رکھا گیا ہو، لیکن اُسے منسوخ یا تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ ان حکومتوں میں قرآن وسنت کو ہی ماخذِ قانون مانا جاتا تھا، عدالتوں میں اسلامی قانون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی نافذ ہوتا تھا اور مسلمان حکمرانوں نے کبھی یہ جرأت نہیں کی کہ قانونِ اسلام کو منسوخ کر کے اس کی جگہ انسانی ساخت کے قوانین جاری کر دیں اور اگر کبھی کسی حکمران نے اس کی جرأت کی تو تاریخ اسلام گواہ ہے کہ کسی نہ کسی اللہ کے بندے نے اُٹھ کر اس کے خلاف جہادِ عظیم کیا، یہاں تک کہ اِس فسق کا سدِباب ہو کر رہا۔ ابن تیمیہؒ اور مجدد الفؒ ثانی نے اس طرح کی کوششوں کے مقابلے میں جو کچھ کیا اُس پر تاریخ گواہ ہے۔

سوال۔ کیا اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے حکم میں ھُمْ کی ضمیر صرف مردوں کی طرف پھرتی ہے عورتیں اُس میں شامل قرار نہیں پا سکتیں؟

جواب۔ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت سے ٹکراتی نہیں ہے بلکہ اُس کی تشریح کرتی ہے جس قرآن میں اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ فرمایا گیا ہے اُسی قرآن میں اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بھی فرمایا گیا ہے۔ اِس لیے مجلس شوریٰ میں جو ساری مملکت کی قوام ہے، عورتوں کی شمولیت کا دروازہ قرآن نے بند کر دیا ہے۔ مزید برآں ہمارے سامنے عہدِ نبوی و خلافتِ راشدہ کا تعامل موجود ہے، جو قرآن کے منشاء کی تعبیر کے لیے مستند ترین ذریعہ ہے۔ ہمیں تاریخ اور حدیث میں کوئی نظیر بھی ایسی نہیں ملتی، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفاء راشدین نے کبھی عورتوں کو مجلس شوریٰ میں شامل کیا ہو۔

سوال۔ اسلامی حکومت کے ذرائع آمدنی کیا ہیں؟ مشہور یہ ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ، جزیہ اور خراج کے سوا کوئی ٹیکس نہیں ہے۔ اگر یہ بات ہے تو موجودہ زمانے میں اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے موجودہ زمانے کی ایک حکومت کے مصارف کیسے پورے ہو سکتے ہیں؟

جواب۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں حکومت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوئی ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ زکوٰۃ کوئی ٹیکس ہے جو حکومت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ زکوٰۃ تو صرف سوشل انشورنس کا ایک فنڈ ہے جو مخصوص مستحقین میں صرف کرنے کے لیے لیا جاتا ہے۔ رہیں حکومت کی ضروریات تو وہ درحقیقت پبلک کی ضروریات ہیں۔ پبلک اپنے جن جن کاموں کے لیے مطالبہ کرے، اُس کا فرض ہے کہ اُن کاموں کی انجام دہی کے لیے حکومت کو فنڈ فراہم کر کے دے۔ جس طرح دوسرے اجتماعی کاموں کے لیے چندہ لیا جاتا ہے اُسی طرح پبلک اپنی جو ضرورتیں حکومت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاتھوں پوری کرانا چاہیے اُن کے لیے بھی اُس کو چندہ دینا چاہیے۔ ٹیکس اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک چندہ ہی تو ہے۔ ہماری قدیم فقہی کتابوں میں "مُکوس" کے نام سے جن ٹیکسوں کی مذمت کی گئی ہے اُن میں اور موجودہ زمانے کے ٹیکسوں میں بہت بڑا اصولی فرق ہے۔ اُس زمانے میں ٹیکس کی حیثیت دراصل پبلک فنڈ کی نہیں تھی، بلکہ وہ ایک باج تھا جو شاہی حکومتیں رعایا سے وصول کرتی تھیں اور بادشاہوں کی مرضی کے مطابق خرچ کرتی تھیں۔ اُن پر اِس امر کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی کہ پبلک سے وصول کی ہوئی ان رقوم کو پبلک ہی کے کاموں پر خرچ کریں اور پبلک کو اس کا حساب دیں۔ اسی وجہ سے اسلام میں ان ٹیکسوں کو حرام اور ناجائز قرار دیا گیا تھا۔ اب جبکہ ٹیکس کی حقیقت بدل چکی ہے اُس کا حکم بھی بدل گیا ہے۔

سوال۔ کیا خلافت کا مسئلہ اِس وقت آسانی سے طے ہو سکتا ہے جبکہ اسلام میں بہتّر فرقے موجود ہیں؟

جواب۔ مَیں یہاں تمام دنیائے اسلام کی خلافت کے مسئلے سے بحث نہیں کر رہا ہوں، بلکہ صرف پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام تک میری گفتگو محدود ہے۔ اگر مختلف مسلمان ملکوں میں اُن اصولوں پر جو مَیں نے ابھی بیان کیے ہیں، اسلامی حکومتیں قائم ہو جائیں تو البتہ ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آئے جب اُن سب کی ایک فیڈریشن بن سکے اور تمام دنیائے اسلام کا ایک خلیفہ منتخب کیا جا سکے۔ رہے بہتّر فرقے تو وہ صرف علمِ کلام کی کتابوں کے صفحات میں پائے جاتے ہیں۔ عملاً پاکستان میں تو اس وقت تین ہی فرقے موجود ہیں۔ ایک حنفی، دوسرے اہلِ حدیث، تیسرے شیعہ۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ان تینوں فرقوں کے علماء پہلے ہی اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں پر اتفاق کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب اس اندیشے کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی ہے کہ فرقوں کی موجودگی اسلامی حکومت کے قیام میں مانع ہوگی۔

سوال۔ پاکستان ہی کی خلافت سہی، کیا ہم میں اس وقت کوئی ایسا شخص موجود ہے، جس کو اس کام کے لیے چُنا جا سکے؟

جواب:۔ اس کا فیصلہ کرنا ووٹروں کا کام ہے اور مَیں اُن میں سے صرف ایک ووٹر ہوں جب انتخاب کی نوبت آئے تو ہم سب سوچیں گے کہ کون اس کے لیے موزوں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوال :- آج تک آپ لوگ اسلامی دستور کے صرف اصول ہی بیان کرتے رہے ہیں، ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ ایک دستور کا مسودہ تیار کر کے پیش کر دیا جاتا؟ ایسا کیا جاتا تو آپ کے مدعا کے لیے زیادہ مفید ہوتا اور لوگوں کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جاتا کہ آپ کس قسم کا نظامِ حکومت چاہتے ہیں؟

جواب :- میرے نزدیک اُس شخص اور اُس جماعت سے بڑھ کر نادان کوئی نہیں جو اختیارات کے بغیر دستور بنانے کی حماقت کرے۔ دستور بنانا صرف اُس جماعت کا کام ہے، جس کی پشت پر نافذ کرنے کی طاقت موجود ہو۔ قوت نفاذ کے بغیر دستور بنا کر پیش کر دینے کی حماقت نہرو رپورٹ کے مصنفین کر چکے ہیں اور اُس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ اُس کے بعد پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں موافقت کا کوئی امکان باقی نہ رہا اور آخر کار ملک تقسیم ہو کر رہا۔ اب کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم بھی اس حماقت کا ارتکاب کریں۔ ہمارا کام صرف اصول پیش کرنا ہے۔ دستور بنانا صرف اُس ادارے کا کام ہے جس کی پشت پر قوتِ تنفیذ موجود ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com